• بشیر احمد ڈار

سرسیّد اور نظریۂ تخلیقِ آدم

انیسویں صدی ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک بڑا اہم دور تھا۔ اس کے ابتدائی حصے میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک نے تمام شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک عام جذبۂ جہاد بیدار کیا اور دوسری طرف معاشرتی اور مذہبی اصلاح کی بنیاد استوار کی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے عوام اور خواص دونوں کے اخلاق و کردار کی بلندی کو بہت حد تک نمایاں کر دیا لیکن اس کی ناکامیابی سے جو نفسیاتی الجھنیں، معاشی بدحالی اور معاشرتی بیماریاں پیدا ہوئیں ان کا اظہار ۱۸۵۷ کے انقلاب کی شکل میں نمودار ہوا۔ جب یہ آگ فرو ہوئی تو حکومت کا انتقامی جذبہ تمام تر مسلمانوں کے لئے وقف ہو گیا اور کئی سالوں تک وہ ہندوؤں اور انگریزوں کے ظلم کا نشانہ بنے رہے۔ اس خطرناک دور (یعنی انیسویں صدی کے آخری نصف) میں سرسید احمد خاں کی ذات تھی جس نے مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض بڑی عمدگی سے ادا کیا۔ اگر آپ اس پُرآشوب دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو آپ کے لئے سرسید کی زندگی اور اس کے افکار کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ وہ ایک فرد ساری قوم کی زندگی اور مایوسی، اس کی تڑپ، اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا آئینہ دار تھا۔ اس نے نہ صرف سیاسی اور تعلیمی میدان میں مسلمانوں کو صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کی بلکہ ان کے مذہبی تصورات کو بھی صدیوں کے گرد و غبار تلے سے نکالا۔ نئے زمانے کے تقاضا کو سمجھتے ہوئے تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہونا چاہیئے تھا اور نہ بند رکھنے سے اسلام کی خدمت ہو سکتی ہے۔ اس نے حدیث اور فقہ قدیم پر بے لاگ تنقید کی اور واضح کر دیا کہ تنقیح حدیث اور تشکیل فقہ کا کام زمانۂ حاضر کے مسلمانوں کے لئے اوّلین ضروریات میں سے ہے۔ اس نے قرآن کی تفسیر لکھ کر ثابت کر دیا کہ اسلام ہر زمانے کے تصورات اور مطالبات کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور یہی قرآن کا معجزہ اور اسلام کی صداقت کا معیار ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے انیسوی صدی کے مغربی علوم سے متاثر ہو کر بعض ایسے خیالات کی ترویج بھی کرنی چاہی جو مذہب کی بنیادی روح کے خلاف تھے لیکن چند غلط نتائج کی وجہ سے ان کے تمام افکار سے بے پروائی برتنا دانشمندی نہیں۔ چند غلط رستوں کو دیکھ کر تدبیروں سے کنارہ کشی کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے اکثر مسائل میں اچھوتے اور نادر نظریات پیش کئے جو گو اس زمانے کے لوگوں کی نگاہ میں قابل قبول نہ تھے لیکن آج وہ مسلمانوں میں اس قدر مروج و مقبول ہیں کہ کسی کو ان کے اچھوتے پن کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ انہی نظریات میں سے نظریۂ تخلیق آدم بھی ہے جو مضمون زیر بحث کا موضوع ہے۔

اگرچہ نظریۂ ارتقاء مسلمان مفکرین کا دلچسپ موضوع رہا ہے اور اسی مفروضہ کی بنیاد پر انہوں نے وحی اور نبوت کے دلائل پیش

بکتے ہیں لیکن آدم کی پیدائش کا قصہ عام طور پر اس نظریہ کے مخالف تصور کیا جاتا رہا۔ انیسویں صدی میں جب ڈارون نے اس نظریہ کو علمی حیثیت سے پیش کیا تو اس کے بعد تخلیق آدم کا پرانا تصور کچھ متناقض معلوم ہونے لگا۔ اگر کائنات میں تدریجی ارتقا ہو رہا ہے تو یقیناً انسانی وجود بھی اسی طرح ظہور پذیر ہونا چاہیے جس طرح کہ دوسری چیزیں۔ چنانچہ سرسید نے اس مسئلہ پر اسی نقطہ نگاہ سے بحث کی اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تخلیق آدم گویا کائنات کے تدریجی ارتقاء میں ایک اہم کڑی ہے اور کسی طرح اس سے متناقض نہیں۔ قرآن میں آدم (اور زمین پر چلنے والے جانداروں) کی تخلیق کے متعلق مختلف جگہ ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ انی خالق بشرا من طین دوسری جگہ خلقہ من تراب، ایک جگہ من صلصال من حما مسنون، ایک جگہ ہے خلق کل دابۃ من الماء اور ایک اور جگہ ذکر آیا ہے وجعلنا من الماء کل شیء حی۔ تراب کے معنی مٹی کے ہیں، طین کے معنی گارے کے، صلصال کے معنی ریتیلے گارے کے، حما مسنون اس بدبو کیچڑ کو کہتے ہیں جو پانی کے نیچے بیٹھی ہوتی ہے۔ "ماء" کے لفظ سے وہ عام پانی ہی مراد لیتے ہیں۔ ان تمام آیتوں کو ملا کر وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کی ترکیب کیمیاوی سے انسان مخلوق ہوا ہے۔

مرکب اشیاء دو طریقوں سے بنتی ہیں۔ ایک اس طرح کہ دو ملنے والی چیزیں آپس میں مل جائیں لیکن بعد میں علیحدہ علیحدہ کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً پانی اور ریت یا پانی اور مٹی۔ لیکن یہ حقیقی ترکیب نہیں کہلا سکتی۔ ترکیب کیمیاوی یہ ہے کہ دو چیزیں آپس میں اس طرح ملیں کہ از خود جدا نہ ہو سکیں بلکہ مل کر ایک تیسری چیز بن جائیں۔ تراب، طین، صلصال، حما مسنون اور پانی کی ترکیب کیمیاوی سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اس سے انسان پیدا ہوا ہے اور اسی سے تمام جاندار۔ سرسید نے گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تخلیق آدم کائنات میں کوئی الگ عمل نہ تھا بلکہ فطرت کے کارخانے کا یہ کام مدتوں سے جاری تھا اور ایک وقت اسی عمل سے اس سطح ارضی پر جمادات اور نباتات کے باہمی توافق سے زندگی کا ظہور ہوا۔ اور قرآن مجید میں قصۂ آدم کا بیان گویا اس دور کے آغاز کا بیان ہے جب انسان اپنی غیر مکلف اور غیر شعوری زندگی کے دور سے نکل کر مکلفانہ یا شعوری زندگی میں قدم رکھتا ہے۔

قصۂ آدم کا دوسرا رخ وہ ہے جب قرآن ملائکہ، ابلیس اور خدا کا مکالمہ بیان کرتا ہے۔ جب خدا نے فرشتوں کو آدم کی تخلیق سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ آدم کے مقابلہ میں وہ نیابت کے زیادہ مستحق ہیں۔ خدا نے اس کے جواب میں یہ ظاہر کیا کہ آدم کی فطرت میں چند ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہی خلیفۃ الارض کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد فرشتوں نے اقرار عجز کیا اور آدم کے لئے سربسجود ہو گئے۔ لیکن ابلیس نے اطاعت سے روگردانی کی اور مردود ٹھہرایا گیا۔ اس قصہ کا تیسرا رخ اس واقعہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خدا نے آدم کو جنت میں ٹھہرنے کا حکم دیا لیکن ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع بھی کر دیا لیکن ابلیس کے ورغلانے سے اس نے وہ پھل کھا لیا جس سے اس کو اپنے ننگے پن کا احساس ہوا لیکن بعد میں اس غلطی پر اس نے ندامت کا اظہار کیا اور خدا سے معافی چاہی۔

سرسید نے اس تمام قصہ کی تشریح کرنے سے قبل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس تمام مکالمہ میں فرشتوں اور ابلیس کا جو ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملائکہ کو ایک علیحدہ اور جداگانہ ہستی فرض کر لینا غلط ہے۔ قرآن میں جن فرشتوں کا ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قوتوں کو جو خدا نے اپنی مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں

[illegible] کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے۔ پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی ڈالیوں کی بڑھنے کی قوت، غرضیکہ تمام قوتیں جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں، وہی ملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح شیطان کے متعلق سرسید کا یہ خیال ہے کہ انسانی نفس امارہ کا دوسرا نام ابلیس ہے۔ اس کی تائید میں کہتے ہیں کہ قرآن میں خناس کا لفظ ہے کہ "جو سینے میں آتے ہیں ان کو ہم جانتے ہیں" اور پھر فرمایا ہے کہ "نفس ہی انسان کو برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔" آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "سب دشمنوں سے زیادہ دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے پہلوؤں میں ہے۔" اور آنحضرت صلعم نے یہ بھی فرمایا کہ "شیطان انسان میں خون کی طرح چلتا ہے"، اور ٹھیک یہ حالت نفس کی ہے۔

اس کے بعد سرسید کہتے ہیں کہ ملائکہ سے مراد قوائے ملکیہ ہے اور ابلیس سے مراد قوائے بہیمیہ ہے اور یہ دونوں انسان کی سرشت میں ہیں اور ان کے نزدیک اس تمام قصے سے مراد صرف یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا نے انسانی فطرت اور اس کے مقتضیات کو واضح کیا ہے۔ اس کو مکالمہ کی شکل میں بیان کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ عوام اور خواص دونوں اس مطلب کو سمجھ سکیں۔ چونکہ عوام معاملات کی تہ کو سمجھنے سے بالعموم عاری ہوتے ہیں اس لئے خدا نے ایک کہانی کے طور پر انسانی فطرت کے راز کو بیان فرمایا ورنہ کہاں کا مباحثہ اور کہاں کا قصہ، بھلا کسی کی جرأت تھی کہ خدا کے سامنے اس کے کسی عمل پر کوئی بالخصوص فرشتے اعتراض کی جرأت کر سکتے؛ چنانچہ ایک جگہ خود قرآن میں فرشتوں کے متعلق لکھا ہے کہ عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون (سورۂ نساء)، یعنی فرشتے وہ معزز بندے ہیں جو خدا کے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے اور جو وہ کہتا ہے وہی وہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی جگہ قرآن میں ایک حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ زمین و آسمان کے متعلق فرمایا کہ "جب ہم نے آسمان و زمین سے کہا کہ تم دونوں خواہ مخواہ حاضر ہو تو دونوں نے کہا کہ ہم خوشی حاضر ہیں" (سورۂ حم سجدہ) یا جہنم کی نسبت ذکر ہے کہ "جس دن ہم جہنم کو کہیں گے کہ کیا تو بھر گئی؛ تو وہ کہے گی کہ ہے اس سے زیادہ اور بھی؟" (سورۂ قاف) ان آیتوں میں خدائے تعالیٰ نے ایسی چیزوں کی زبان حال سے جو گویا نہیں ہیں سوال و جواب کے طور پر ان کی فطرت کو بیان کیا ہے۔

یہاں سرسید نے قرآن فہمی کا ایک اصول بیان کیا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ بلاشک خدا کے الفاظ ہیں لیکن ان الفاظ کو سمجھنے کے لئے ہمیں انسانی محاورے سے بے اعتنائی نہیں برتنی چاہیئے، وہ انسان کی زبان اور انسان کے محاورہ اور بول چال میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ ان مطالب کو بیان کرنے کے لئے جو ہمارے تجربہ اور مشاہدہ سے بالاتر ہیں، قرآن مثالوں اور حکایتوں کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ اگر اس اصول کو نظرانداز کر دیا جائے اور تمام تمثیلوں اور حکایتوں کو یوں قرار دیا جائے کہ گویا حقیقت میں یوں ہی ہوا ہے تو یہ گویا تفسیر القرآن بما لا [illegible] میں داخل ہوگا۔

اس قصے میں چند الفاظ تشریح طلب ہیں۔ اول آدم۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ آدم ایک فرد واحد ہے جس کے متعلق قرآن یہ قصہ بیان کرتا ہے لیکن سرسید نے اس تصور کو غلط قرار دیا اور کہا کہ آدم سے مراد نوع انسانی ہے نہ کہ ایک فرد۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ اس قصے میں آدم سے ذات خاص مراد نہیں جس کو عوام الناس اور مسجد کے ملا بابا آدم کہتے ہیں بلکہ اس سے مراد نوع انسانی ہے۔ خود قرآن میں بصراحت [illegible]

کم ثم صورناکم ثم قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم - یہاں تک کہ خطاب کل انسانوں کی طرف ہے اور آدم سے مراد بنی آدم یعنی نوع انسان ہے۔ دوسرا لفظ ہے "اسماء"۔ سرسید کے نزدیک اسماء کے معنی مختلف چیزوں مثلاً گھوڑا، گدھا وغیرہ کے نام نہیں ہو سکتے جو شاید اس وقت خارج میں موجود تھیں یا نہیں بلکہ ان سے مراد قویٰ ہیں جن کے سبب اس کا ذہن ایک نشان یا دلیل سے دوسری طرف منتقل ہوتا ہے اور نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ قویٰ ایسے تھے جن سے انسان تمام چیزوں محسوسات و معقولات کو جان سکتا ہے اور اسی لئے "کلہا" کے لفظ سے اس کی تاکید کی ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام چیزوں کے جاننے کا مادہ انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ان قویٰ کو اسماء کے لفظ سے تعبیر کرنے میں سرسید کے نزدیک یہ راز ہے کہ انسان کسی چیز کی حقیقت و ماہیت کو نہیں جانتا، جو کچھ وہ جانتا ہے وہ صرف اسماء ہی اسماء ہیں۔

فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنے اور ابلیس کا انکار کرنے سے سرسید یہ مراد لیتے ہیں کہ قوتِ ملکیہ یعنی نیکی کا عنصر انسان میں موجود ہے اور وہ ہر لمحہ اس کے قابو میں ہے۔ جس وقت انسان کسی ایسی قوت کو تحریک دینا چاہے جو نیکی کا مخرج ہے تو وہ فی الفور تحریک میں آجاتی ہے اور نیکی، رحم، محبت وغیرہ اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ قوت جو بدی اور گناہ کا مخرج ہے، وہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان کے قبضے میں نہیں۔ ان افعال کو جو اس قوت سے بیدار ہوتے ہیں ہم برا جانتے ہیں اور نہ کرنے کا ارادہ بھی کرتے ہیں لیکن پھر کرتے بھی جاتے ہیں۔ اس کو قرآن نے قوت بہیمیہ کی سرکشی اور سجدہ سے انکار سے مثال دی ہے۔ جب خدا نے ابلیس کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر تو اس سے سرسید یہ مطلب لیتے ہیں کہ خدا نے ایسے اسباب بنا دیئے ہیں اور انسان میں ایسے قویٰ رکھ دیئے ہیں کہ وہ انسان کا مطیع ہو سکتا ہے اگرچہ بغاوت اور سرکشی قوائے بہیمیہ کی عمومی سرشت ہے۔

اس کے بعد قصہ آدم کا آخری پہلو سامنے آتا ہے جب وہ جنت میں تھا اور ابلیس کے ورغلانے سے اس نے درخت ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ علمائے متقدمین نے یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ جنت عالم بالا پر بہشت کا نام ہے جس میں آدم اور اس کی بیوی کو رکھا گیا۔ بعض کا خیال تھا کہ جنت زمین پر تھی اور ہبوط آدم کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے ان دونوں کو اس جنت سے باہر نکال دیا۔ معتزلہ کے نزدیک یہ جنت فلسطین میں واقع تھی۔ لیکن چونکہ سرسید اس تمام قصہ کو انسانی فطرت کے متعلق ایک تمثیلی بیان سمجھتے ہیں اس لئے انہوں نے جنت کے متعلق ایک بالکل اچھوتا نقطہ نگاہ پیش کیا۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کی غیر شعوری حالت کو جب وہ ابھی حیوانی منزل سے ترقی کر کے انسانی منزل میں داخل نہیں ہوا تھا، خدا نے بہشت کی زندگی کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اس زندگی میں خیر و شر، درست و نادرست کی کوئی تمیز نہیں ہوتی اور وہ کسی امر کے لئے مکلف ہوتا ہے۔ اس کا کام بجز کھانے پینے اور گھومنے کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ ایسی ہی غیر مکلف زندگی کو جو صحیح انسانی شعور سے قبل تھی جنت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شجر ممنوعہ سے مراد سرسید کے نزدیک عقل و تمیز ہے۔ یعنی جب جنت کی زندگی میں کچھ مدت کے بعد انسان نے اپنی قوت بہیمیہ کے کہنے پر اس درخت کے پھل کو کھا لیا تو گویا وہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اس سے پہلے وہ قوت انسان میں موجود تھی لیکن اس کے فوائد و نقصانات سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ جب زندگی کا یہ نیا دور شروع ہونے والا تھا تو اسی قوت سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اگرچہ اس کا استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ تھا لیکن انسانیت کا کمال بھی اسی میں مضمر تھا۔ اس کے بغیر حیوانی زندگی سے نکل

خالص انسانی زندگی میں داخل ہونا ناممکن تھا چنانچہ یہی ہوا۔ سرسید کے نزدیک اس قوت کے استعمال ہی کو قرآن نے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جب حیوانی زندگی کے بعد انسانی زندگی کا ارتقاء ناگزیر تھا تو پھر اس پھل کو ممنوعہ کیوں قرار دیا گیا؟ اور اس کے کھا لینے سے آدم گنہگار کیسے ہوا؟ سرسید نے اس مسئلے کا حل انسانی جبر و اختیار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان مجبور محض ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ خود مختار ہے اور اپنے تمام افعال پر قادر ہے، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نہ مجبور ہے اور نہ قادر بلکہ حقیقت بین الجبر و الاختیار ہے۔ اس مقام پر سرسید کے خیال میں خدا نے یہ بات واضح کی ہے کہ جو قوتیں انسان میں موجود ہیں وہ ان کو استعمال کرنے میں مالک مختار ہے اور ان سب کو وہ خود کام میں لا سکتا ہے پس خدا کے منع کرنے اور انسان کا اس کے کھا لینے سے انسان کا ان قوتوں پر قادر ہونا اور ان کے استعمال کی خود قدرت رکھنا بتایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے ایک ایسا عمل کیا جس کے کرنے سے اسے منع کیا گیا تھا اور یہی اس کے گناہ کا باعث ہوا لیکن اسی ایک غلط اقدام نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اب وہ حیوانی زندگی سے نکل کر صحیح انسانی منزل میں پہنچ چکا ہے جہاں اب اسے ایک نئے ماحول کی ضرورت ہے جو اس کی قوت عقل و تمیز، رشد و ہدایت کے لئے زیادہ سازگار ہو۔ انسان کی نجات سرسید کے خیال میں اگر کسی چیز میں مضمر ہے تو صرف اس میں کہ وہ اپنے تمام قوتوں کا پورا پورا استعمال کرے۔ اگر قوائے بہیمیہ اس پر غالب ہیں اور قوائے ملکیہ کمزور تو ان کمزور قوتوں کو بیکار نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ان کو کام میں لاتے رہنا ہی ان گناہوں کا علاج ہے جس کو انبیاء کی زبان میں توبہ کہتے ہیں۔ سرسید کے نزدیک ہبوط کا مطلب انتقال مکانی نہیں بلکہ انتقال ہیئت ہے یعنی حیوانی زندگی سے نکل کر انسانی زندگی کی بلند منزل پر پہنچنے کو قرآن نے ہبوط کے لفظ سے تعبیر کیا اور اس طرح سرسید کے خیال میں ہبوط آدم در حقیقت زوال آدم نہیں بلکہ عروج انسانیت ہے۔

اسلام کی بنیادی حقیقتیں

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

قیمت: دو روپے آٹھ آنے

افکار ابن خلدون

مولانا محمد حنیف ندوی

قیمت:- تین روپے

طب العرب

مترجمہ:- سید علی احمد صاحب نیر واسطی

قیمت:- چھ روپے

بیدل

مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر

قیمت:- پانچ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور